سلسلۂ اشاعتِ تنظیمِ اسلامی نمبر۲

تنظیمِ اسلامی

کا

تاریخی پس منظر

یعنی

امت مسلمہ کے عروج وزوال کے دو ادوار، اور موجودہ احیائی

مساعی کے تناظر میں تنظیم اسلامی کا محل ومقام

O

ڈاکٹر اسرار احمد

O

تنظیم اسلامی پاکستان

٦٧۔اے علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

قَالَ

رَسُوْلُ اللّٰہِ

صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

”لَیَأْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ مَا اَتٰی عَلٰی

بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ ...“

رَوَاہُ التِّرمِذِیُّ ؒ

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ عَمْرٍو ؓ

O

حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہما

راوی ہیں کہ

آنحضور ﷺ نے فرمایا:

”میری امت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہوکر رہیں

گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک

جُوتا دوسرے جوتے سے مشابہ ہوتا ہے“

تقدیم

پیش نظر کتابچہ میری جس تحریر پر مشتمل ہے وہ ۱۹۷۴ء کے اواخر میں ماہ رمضانِ مبارک کے دوران بحالت اعتکاف سپردِ قلم ہوئی تھی۔ اور اولاً ماہنامہ 'میثاق' کی اکتوبر و نومبر ۷۴ء کی مشترک اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔

اس سے چند ماہ قبل ۲۱ر جولائی کو راقم ایک مفصل تقریر میں 'تنظیمِ اسلامی' کے قیام یا صحیح تر الفاظ میں احیاء کا اعلان کر چکا تھا۔ اس تقریر کا اکثر حصہ 'میثاق' بابت ستمبر ۷۴ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اور بقیہ متذکرہ بالا مشترک اشاعت میں شامل تھا۔

بعدازاں ۱۹۷۹ء میں ان دونوں کو یکجا کتابی صورت میں ''سرافگندیم'' کے نام سے شائع کر دیا گیا تھا۔ ادھر ایک عرصے سے یہ کتاب نایاب تھی۔ اب مذکورہ تقریر سلسلۂ اشاعت تنظیم اسلامی نمبر ا کی حیثیت میں ''عزمِ تنظیم'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ چنانچہ یہ تحریر سلسلۂ اشاعت نمبر ۲ کی حیثیت سے پیش خدمت ہے۔

اس تحریر کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس امر کی وضاحت کی جائے کہ بیسویں صدی عیسوی کے وسط اور چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں امت مسلمہ کے طول و عرض میں جو ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' جاری ہوا اور از مشرقِ بعید تا مغربِ اقصیٰ مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے ذریعے جو تجدیدی مساعی منظر عام پر آئیں، ذاتی طور پر راقم الحروف اور اجتماعی حیثیت میں تنظیمِ اسلامی کی جدوجہد ان کے کس گوشے سے تعلق رکھتی ہے۔ (چنانچہ اس تحریر کا بڑا حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔) لیکن چونکہ بفحوائے الفاظِ قرآنی ﴿كُنتُمْ أَمْوَاتاً فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ (البقرہ ۲۸) 'احیاء' سے قبل کسی موت کا تصور لازمی و لابدی ہے، لہٰذا ذہن امت کے عروج و زوال کی تاریخ کی جانب منتقل ہوا۔ اور اسی اثناء میں کہ راقم امت کی تاریخ کے نشیب و فراز میں غلطاں و پیچاں تھا، اچانک ایک حدیثِ نبویؐ ذہن میں بجلی کے مانند کوند گئی جس نے بعینہٖ وہی کام کیا جو ایک بہت بڑے خزانے کو کھولنے کے لئے ایک چھوٹی سی کنجی کرتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے قول مبارک ''لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِىْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ ..... '' کی عظیم کلید نے مجھ پر امتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ مختلف ادوار کے علم و فہم کا وہ خزانہ منکشف فرما دیا جو ؎ ''خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں۔ گفتہ آید در حدیث دیگراں!'' کے مصداق سابقہ امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے مختلف ادوار کے تذکرہ پر مشتمل سورۂ بنی اسرائیل کی چند ابتدائی آیات میں مضمر تھا! **فَلَهُ الْحَمْدُ وَ المنّه**

محض تَحْدِيْثاً لِّلنِّعْمَه عرض ہے کہ اس سے ذاتی طور پر راقم کے سرمایۂ ایمان و یقین میں تین اعتبارات سے گراں قدر اضافہ ہوا، چنانچہ ایک جانب میرے قلب پر عظمتِ قرآن کا نقش مزید گہرا ہوا، خصوصاً اس پہلو سے جس کا ذکر نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ مبارکہ میں فرمایا ہے کہ فِيْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ (ترمذیؒ و دارمیؒ عن علیؓ)۔ دوسری جانب حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت آشکارا ہوئی کہ علم و حکمت کے کیسے کیسے قیمتی ہیرے اور خوبصورت موتی اس میں موجود ہیں، اور تیسری جانب قرآن اور حدیث کے مابین ربط کی اہمیت کا اندازہ ہوا کہ دین کے عملی پہلوؤں یعنی احکام شریعت کے ضمن میں تو کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کا باہمی لزوم واضح اور مسلم ہے ہی، قرآن حکیم کے علم و حکمت اور ہدایت و معرفت کے خزانوں کے لئے بھی نبی اکرم ﷺ کے چھوٹے چھوٹے فرمودات کلید کی حیثیت رکھتے ہیں!

بہرحال ان گہرے تاثرات کے ساتھ جب قلم حرکت میں آیا تو ایک سیلاب کی سی 'آمد' کے ساتھ وہ تحریر صادر ہو گئی جس پر دوسروں نے جو خراجِ تحسین ادا کیا اس سے قطع نظر، اب سولہ سال بعد 'نظر ثانی' کی غرض سے جب خود میں نے اسے پڑھا تو حیران رہ گیا کہ ع ''ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی''۔ اس لئے کہ اس کے ذریعے امت مسلمہ کی چودہ صد سالہ تاریخ کے وہ جملہ اہم نقوش غایتِ اختصار کے ساتھ کل بارہ صفحات میں ثبت ہو گئے ہیں، جن کا علم تجدید و احیائے دین کی خواہش رکھنے والے ہر شخص کے لئے تو لازمی و لابدی ہے ہی، عام مسلمانوں کے لئے بھی بہت مفید ہے۔

راقم کی اپنی تحریر میں امت مسلمہ کی تاریخ کے مختلف ادوار کے سلسلے میں تاریخ بنی اسرائیل کے حوالے محض ضمناً آئے ہیں، لیکن اب اس کی افادیت میں اضافے کی غرض سے تاریخ بنی اسرائیل کا ایک خاکہ بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ اس ضمیمے کے صرف عنوانات راقم نے قائم کئے ہیں، باقی سارا مواد سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے ان تفسیری حواشی سے ماخوذ ہے جو ''تفہیم القرآن'' جلد دوم میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کے ذیل میں درج ہیں۔ [(۱)]

ان دونوں کے تقابلی مطالعے سے، ان شاء اللہ العزیز، علم و حکمت کے ہر طالب پر کسی مسلمان

---

(۱) مختصر ترین الفاظ میں یہ مضمون راقم کی تالیف ''استحکام پاکستان'' کے باب نہم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

امت کی تشکیل وتاسیس کی اصل بنیاد اور اس کے عروج وزوال کے اسباب وعلل ایسے اہم مسائل کے ضمن میں فلسفۂ تاریخ وعمرانیات کے فہم اور تفقہ کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس سلسلہ میں چند اضافی نکات کی جانب اجمالی اشارہ سطورِ ذیل میں کیا جارہا ہے، فَافْهَمُوْا وَتَدَبَّرُوْا!

۱۔ امت مسلمہ کی تشکیل کی اساس کتاب الٰہی ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ بنی اسرائیل کا آغاز تورات کے حوالے سے کیا گیا، اور بحیثیت امت مسلمہ ان کے دور کے خاتمے اور نئی امت مسلمہ یعنی امت محمدؐ کے دور کا آغاز کا اعلان قرآن کے حوالے سے کیا گیا۔

۲۔ امت محمدؐ دونوں قبلوں کی متولی بنادی گئی۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز آنحضورؐ کے سفرِ معراج کے پہلے اور زمینی حصے یعنی مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کے ذکر سے کیا گیا۔

۳۔ کتاب اللہ کی تعلیم کا لُبِّ لباب توحید ہے، اور توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ توکل اللہ کے سوا اور کسی ہستی یا چیز پر نہ رہے! ﴿اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا﴾

۴۔ امت محمدؐ کے عروج اول کا دور حیاتِ نبویؐ ہی میں شروع ہوگیا تھا اس لئے کہ اللہ نے آپؐ کے دستِ مبارک ہی سے انقلاب کی تکمیل کرادی تھی۔ جب کہ سابقہ امت کا عروجِ اول اپنے رسول یعنی حضرت موسیٰؑ اور ان کو کتاب دیئے جانے کے لگ بھگ تین سو سال بعد شروع ہوا، اس لئے کہ بنی اسرائیل کی بزدلی کے باعث حضرت موسیٰؑ کی حیاتِ دنیوی کے دوران انقلاب کی تکمیل نہیں ہو پائی تھی۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں تاریخ بنی اسرائیل کے اس دور کا ذکر موجود نہیں ہے۔

۵۔ زوالِ اول کے ضمن میں عذابِ الٰہی کے کوڑے دونوں امتوں پر دو مرحلوں میں پڑے: بنی اسرائیل پر پہلے اشوریوں کے ہاتھوں جو شمال سے حملہ آور ہوئے، اور بعد ازاں کلدانیوں کے ہاتھوں جو مشرق سے حملہ آور ہوئے۔ اور مسلمانوں پر پہلے صلیبیوں کے ہاتھوں جو شمال مغرب سے آئے، اور پھر تاتاریوں کے ہاتھوں جن کا سیلاب مشرق کی جانب سے آیا۔

۶۔ سابقہ امت مسلمہ چونکہ صرف ایک 'قوم' یعنی بنی اسرائیل پر مشتمل تھی لہٰذا اس میں تجدید واحیاء کا کام بھی لامحالہ ان ہی کے ذریعے ہوا۔ امتِ محمدؐ چونکہ واضح طور پر دو حصوں پر مشتمل ہے یعنی اُمیّین اور اٰخَرِین پر، لہٰذا اس کے ضمن میں ﴿یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ﴾ (محمد ۳۸) پر عمل ہوا، اور عروج ثانی عربوں کی قیادت میں نہیں بلکہ ترکوں کی قیادت میں ہوا۔

۷۔ دونوں امتوں پر زوال کا دوسرا اور طویل تر دور یورپی اقوام کے ہاتھوں آیا۔ بنی اسرائیل پر رومیوں کے ہاتھوں، اور مسلمانوں پر فرانسیسیوں، انگریزوں، ولندیزیوں اور اطالویوں وغیرہ کے ذریعے!

۸۔ بعثتِ محمدیؐ کے موقع پر سابقہ امت کے لئے رحمتِ خداوندی کے سایہ تلے آنے کا آخری موقع پیدا ہوا تھا جسے اس نے اپنی شامتِ اعمال سے کھودیا، لہٰذا ان کا دوسرا دورِ زوال تا حال جاری ہے۔ چنانچہ ان پر ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ کی وعید کا ظہور تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ جس کی نمایاں ترین مثال نصف صدی پیشتر کا وہ عذاب ہے جو ان پر جرمنوں کے ہاتھوں آیا۔ اور جسے یہ ہالوکاسٹ (Holocaust) سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاہم اس کا اصل نقطۂ عروج خروجِ دجال اور نزولِ مسیحؑ کے موقع پر ہوگا۔ جس کا وقت اب زیادہ دور محسوس نہیں ہوتا۔

۹۔ بعثتِ محمدیؐ کے بعد سے رحمتِ خداوندی میں داخلے کا واحد 'شاہ درہ' قرآن حکیم ہے، جس کی جانب اب سے چودہ سو سال قبل بنی اسرائیل کی رہنمائی کی گئی تھی، اور اب امت مسلمہ کے لئے بھی زوالِ ثانی سے نکل کر عروج سوم کی جانب پیشقدمی کا واحد راستہ ''رجوع الی القرآن'' ہے! یہی وجہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کے آخر میں بھی فرمایا گیا ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ﴾ پھر پوری سورۂ مبارکہ کا عمود ہی عظمتِ قرآن کا بیان ہے، بالخصوص یہ آیاتِ مبارکہ نہایت قابلِ توجہ ہیں ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ اور ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ اور اختتام سورہ پر تو نہایت پُر شکوہ اور پُر جلال انداز اختیار فرمایا گیا۔ یعنی ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ جس کی کامل ترجمانی ہے نبی اکرم ﷺ کے اس قول مبارک میں کہ اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ (مسلمؒ عن عمرؓ) چنانچہ اس امر پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ تنظیم اسلامی کا 'مبنیٰ' ہی نہیں 'محور' بھی ''رجوع الی القرآن'' ہے۔

۱۰۔ امتِ مسلمہ کا تیسرا اور آخری عروج، جس کی جانب پیشقدمی شروع ہوچکی ہے تقدیر مبرم کی طرح لازمی اور اٹل ہے۔[1] تاہم بفحوائے الفاظ قرآنی ﴿وَاِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾ (الانبیاء ۱۰۹) نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مرحلہ ابھی کتنی دور ہے، نہ اس کا اندازہ کیا جا

---

(۱) ملاحظہ ہو میری تالیف ''استحکامِ پاکستان'' کا باب نہم!

سکتا ہے کہ اس سے قبل ابھی امت کو اور کون کون سے صدمے جھیلنے اور مصائب برداشت کرنے ہوں گے، مزید براں یہ بھی بعید نہیں کہ اس عروج ثالث کے سلسلے میں تاریخ اپنے آپ کو دہرائے اور قدرتِ خداوندی موجود الوقت جملہ نام نہاد مسلمان اقوام کو رد کر کے کسی بالکل نئی قوم کے ہاتھوں میں اپنے دین کا جھنڈا تھما دے۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز!!**

موجودہ تجدیدی مساعی اور ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' کے جائزے کے بارے میں بھی راقم کو اطمینان ہے کہ بحمد للہ اب سے سولہ سال قبل ضبطِ تحریر میں آنے والا یہ جائزہ بھی نہ صرف یہ کہ نہایت جامع ہے، بلکہ بہت فکر انگیز بھی ہے۔ اور اس کے ذریعے امید واثق ہے کہ ایک جانب تمام خادمانِ دین اور مخلصینِ ملت کے فکر و نظر کو وسعت حاصل ہو گی اور وہ ''انا ولا غیری'' کی تنگ گھاٹی سے نکل آئیں گے اور وسیع تر تناظر میں جملہ احیائی مساعی کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، اور دوسری جانب تنظیمِ اسلامی کے کارکنان تاریخ کے دھارے میں اپنے مقام، محل، اور موقف کا واضح شعور اور اپنے پیشِ نظر کام کے حدودِ اربعہ اور اصول و قواعد کا واضح فہم حاصل کر کے ذہن و قلب کی پوری یکسوئی کے ساتھ جد و جہد میں منہمک ہو سکیں گے، اور وقتی سیاسی ہنگاموں اور زَبَدًا رَّابِیًا (الرعد ۱۷) کی مانند عارضی اور سطحی جوش و خروش کے ساتھ اٹھنے والی تحریکوں سے متاثر ہو کر اپنا وقت ضائع اور منزل کھوٹی نہیں کریں گے۔ **اللھم امین!**

اسرار احمد

۱۹ فروری ۹۱ء

امت مسلمہ کے عروج و زوال کے دو دَور

(تاریخ بنی اسرائیل کے پس منظر میں)

اور

موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ط اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۱) وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا (۲) ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ط اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (۳) وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۴) فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ط وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (۵) ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا (۶) اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ قف وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (۷) عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ج وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا (۸) اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا (۹) وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۰) (سورہ بنی اسرائیل)

امت مسلمہ کے عروج وزوال کے دو دَور

ہمارے نزدیک بیسویں صدی عیسوی کو امتِ مسلمہ کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ (Turning point) کی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ اس کے رُبعِ اول کے خاتمے کے لگ بھگ جب کہ امت کے ایک حساس اور دردمند فرد کے دل کی گہرائیوں سے یہ درد انگیز صدا بلند ہوئی ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے! (حالؔی)

تاریخ ایک کروٹ لے چکی تھی اور ملتِ اسلامی کے تنِ مردہ میں حیاتِ تازہ کے کچھ آثار ظاہر ہونے شروع ہو چکے تھے۔

اور اگر ذرا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا جائے تو اس صدی کا درمیانی نصف تو ایک نہایت ہی عجیب نقشہ پیش کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تنزل اور انحطاط کا عمل بھی جاری رہا اور نکبت وادبار کے سائے مزید گہرے ہوتے چلے گئے جس کا نقطۂ عروج (Climax) ۶۷ء اور ۷۱ء کی ذلت ورسوائی ہے[۱] اور دوسری طرف ایک گھمبیر اور ہمہ جہتی احیائی عمل کا آغاز بھی ہو گیا جس کا نقطۂ آغاز ۲۰-۲۵ء کا زمانہ ہے۔ گویا مسلسل بچاس برس تک یہ دونوں ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝﴾[۲] کی سی شان کے ساتھ پہلو بہ پہلو جاری رہے۔

اس اجمال کی تفصیل کے ضمن میں ہم پہلے امت مسلمہ کے عروج وزوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب (Chronological Order) کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کریں گے، تاکہ ایک طرف 'عروج' کے ضمن میں ملتِ اسلامی کی عظمت وسطوتِ گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تُو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبرالٹر (جبل الطارق) سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی ''وی آنا'' کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں۔ شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دل میں ملتِ اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت وسطوتِ گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اور دوسری طرف 'زوال' کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر مبدل۔ اس نے جو معاملہ سابق امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہٖ وہی ہمارے ساتھ کیا، حتیٰ کہ ہماری اور ان کی تاریخ میں ایک حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دور آئے۔ اگرچہ امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وسعت کی نسبت سے ہمارے نکبت وادبار کے یہ دور بھی یہود کے مقابلے میں بہت طویل رہے اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!

کے مصداق دو بار چاک ہوا، اسی طرح ہمارے عہدِ تولیت میں بھی مسجدِ اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

اس کے بعد ہم اس گھمبیر اور ہمہ جہتی ''احیائی عمل'' کا اجمالاً جائزہ لیں گے تاکہ ایک طرف لوگوں کا افق ذہنی وسیع ہو اور وہ مختلف احیائی کوششوں کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھ سکیں اور دوسری طرف یہ

---

(۱) اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خوش فہمی ہی تھی۔ امت مسلمہ کے دوسرے دورِ زوال کی انتہا شاید اب آیا چاہتی ہے۔ (جنوری ۱۹۹۱ء)

(۲) سورۃ الرحمٰن، آیات ۱۹، ۲۰: ''چلائے دو دریا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ، (لیکن) دونوں کے مابین ایک پردہ (حائل) ہے کہ باہم ایک دوسرے پر غالب نہ آسکیں!''

بھی واضح ہو جائے کہ ہم خود اس ہمہ جہتی احیائی عمل کے کس گوشے میں ایک حقیر سی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کررہے ہیں۔ تا کہ ﴿ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ﴾ (۱) کے مصداق جو ہمارا ساتھ دینا چاہے وہ بھی پورے انشراحِ صدر کے ساتھ دے اور جو تنقید کی 'خدمت' سرانجام دینا چاہے وہ بھی ہمارے موقف کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ہی اس اہم مگر نازک فرض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو!

امتِ مسلمہ کے عروج وزوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیشگی سمجھ لینی چاہئیں:

ایک یہ کہ اپنی ہیئتِ تشکیلی کے اعتبار سے امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو حصے ہیں۔ پہلا اُمیّیــــن یعنی بنی اسمٰعیل پر مشتمل ہے اور اسے اس امت کے قلب یا مرکز (Nucleus) کی حیثیت حاصل ہے اور دوسرا آخَـــرِیـن یعنی دیگر اقوام پر مشتمل ہے خواہ وہ کُرد ہوں یا ترک، اہلِ فارس ہوں یا اہلِ ہند، افغان ہوں یا مغل، اہلِ حبش ہوں یا بربر، مشرقِ بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغربِ بعید یعنی مراکو اور موریطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالمِ اسلام کو تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہئے۔ یعنی ایک قلب، دوسرے میمنہ اور تیسرے میسرہ۔ اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالمِ اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محوِ پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب، عراق، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک جو عالمِ اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے، جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے کو اس کے دُم کے پھیلے ہوئے پروں سے۔ اس عقاب کا دایاں بازو (میمنہ) ایران، ترکستان، افغانستان اور برصغیر ہندو پاک سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور بایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہوا سپین تک چلا گیا ہے۔

اب آیئے تاریخی خاکے کی طرف:

سنِ عیسوی (۲) کے حساب سے امتِ مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے، اس لئے

---

(۱) سورۃ الانفال آیت ۴۲: ''تا کہ ہلاک ہو جسے ہلاک ہونا ہے حجت قائم ہو چکنے کے بعد اور جئے جسے جینا ہو واضح دلیل کے ساتھ!''

(۲) چونکہ اکثر لوگوں کے اذہان سنِ عیسوی ہی کے ساتھ زیادہ مانوس ہیں لہٰذا یہاں اسی کو پیشِ نظر رکھا جا رہا ہے۔

کہ آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت اغلباً ۵۷۱ء میں ہوئی۔ ۶۱۰ء میں آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل ۶۳۲ء میں آپ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک 'اسلامی انقلاب' کی تکمیل فرما کر ''رفیقِ اعلیٰ'' سے جا ملے، **فصلی اللہ علیه وبارک وسلم تسلیما کثیـــــرا**۔ اصحابِ ثلٰثہ یعنی حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہدِ خلافت کے دوران اُمیّیـــــن ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران وعراق، شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں تو یہ عمل رکا رہا، لیکن بنو امیہ کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان، افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سپین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ اُمیّیِـن کے زیرِنگیں آ گیا اور عالمِ اسلام کی سرحدیں تین براعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں۔

آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دور ہے جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالمِ اسلام کی سیادت دونوں اُمیّیــــن کی دو اہم شاخوں یعنی بنوامیہ اور بنوعباس کے پاس رہیں (۱) اور روئے ارضی کے ایک بڑے حصے پر ان کے دین ومذہب، ان کے تہذیب وتمدن، ان کے علوم وفنون اور ان کی شان وشوکت کا سکہ رواں رہا۔ لیکن جیسے جیسے دنیوی جاہ وجلال میں اضافہ ہوا، جذباتِ دینی اور حرارتِ ایمانی میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت ضرور صرف ہوئی لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے دوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنے عالم پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔

---

(۱) ان میں سے بھی صرف بنو امیہ کے دورِ حکومت کو خالص عرب غلبہ واقتدار کا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ بنوعباس کے دورِ حکومت میں ابتدا ہی سے اہلِ عجم کو حکومت وسلطنت کے معاملات میں فیصلہ کن دخل حاصل ہو گیا تھا اور دراصل اسی نے عرب اقتدار کے تناور درخت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چٹ کر لیا، ورنہ خالص عرب خون میں جو حرارت تھی اور قوتِ مقاومت موجود تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بنو امیہ کی ایک شاخ جس نے اندلس میں قدم جمائے وہ عالمِ اسلام کے قلب سے عرب قوت کے کلی خاتمے کے بھی تین صدی بعد تک پھلتی پھولتی رہی اور اس کا خاتمہ کہیں پندرہویں صدی عیسوی میں جا کر ہوا۔

گیارہویں صدی عیسوی کے دوران اُمیّیّــــن کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب میں قوت کا ایک خلا (Power Vacuum) پیدا ہو گیا۔

خوش قسمتی سے قوت کے دباؤ میں اس کمی (Depression) کے نتیجے میں عالمِ اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلبِ اسلام کی طرف کھنچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے۔ یعنی کُرد اور ترکانِ سلجوقی جنہوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران شام، فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لئے کسی قدر تازہ دم قوت فراہم ہو گئی۔[1]

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران میں امت مسلمہ پر گویا عذابِ خداوندی کے ''وعدہ اولی'' کا ظہور ہوا اور ہو بہو ﴿بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ﴾[2] کا نقشہ کھنچ گیا۔ چنانچہ پہلے شمال سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے۔[3] اور ۱۰۹۹ء میں نہ صرف یہ کہ مسجدِ اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا بلکہ بیت المقدس میں وہ قتلِ عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا۔ اس لئے کہ دولت عباسی تو ''مرنے والی امتوں کے عالمِ پیری'' کا نقشہ پیش کر رہی تھی، گویا اُمیّیّن میں تو سرے سے دم خم باقی ہی نہ رہا تھا۔ بالآخر اٰخَرین کے تازہ وگرم خون نے مجاہدِ کبیر صلاح الدین ایوبیؒ کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی اور اس طوفان کا رخ موڑا۔ اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنۂ تاتار کا وہ طوفانِ عظیم جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور بالآخر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تہِ تیغ ہوئے، بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہو گئی جو کم وبیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس کی ہوئی تھی۔ نتیجۃً زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین کے ساتھ ہی خلافت عباسی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالکل گُل ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ امتِ مسلمہ پر عذابِ خداوندی

(۱) یہ اسی دور کی بات ہے کہ افغان قبائل نے جنوب مشرق کا رخ کیا اور ہندوستان پر حملے شروع کئے جس سے ہند میں مسلمانوں کی عظیم الشان مملکت کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔

(۲) سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵: ''بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت جنگجو، جو گھس گئے اور پھیل گئے شہروں کے مابین''

(۳) جیسے بنی اسرائیل پر بھی پہلی تباہی شمال سے حملہ آور ہونے والے آشوریوں کے ہاتھوں آئی تھی۔

کا یہ پہلا دور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم از کم اُمیّیّن کی حد تک تو ﴿وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾[1] کی وعید بھی پوری ہو گئی اور وہ عالم اسلام کی سیادت وقیادت کے منصب سے معزول کر دیئے گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۲۶۰ء میں اس طوفان کا رخ بھی اٰخــرِیــن ہی نے پھیرا جس سے کم از کم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت وتاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران عالمِ اسلام کا قلب بعینہٖ وہی نقشہ پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ ﴿أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾[2] لیکن پھر امتِ مسلمہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا ظہور بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا یعنی ﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا﴾[3] صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ امت مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی 'نشأۃ ثانیہ' کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی نسل کے اندر واقع ہوا۔ لیکن امتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی، لہٰذا یہاں 'تجدید ملت' کا یہ کام اٰخَـرِین کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکانِ چنگیزی کا بڑا حصہ اسلام لے آیا[4] جن کے ہاتھوں عالمِ اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالمِ اسلام کے دائیں بازو کی توسیع کی اور دوسرے یعنی ترکانِ عثمانی نے ابتداءً ایشیائے کوچک میں قدم جمائے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پورے مشرقی یورپ پر اپنی بالا دستی کا سکہ جمایا، یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت وسیادت کی ذمہ داری سنبھالی تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا۔ اور اس طرح گویا عالمِ اسلام کے قلب کی عظمت وسطوتِ گزشتہ پھر پوری طرح لوٹ آئی۔ اگر چہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں کے

(۱) سورۃ محمدؐ آیت ۳۸: ''اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو (اللہ) تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا''

(۲) سورۃ البقرہ آیت ۲۵۹: ''کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے، اس کی موت کے بعد''

(۳) سورۃ بنی اسرائیل آیت ۶: ''پھر ہم نے تمہیں ان پر دوبارہ غلبہ عطا فرمایا اور تمہاری مدد کی مال واسباب اور بیٹوں سے اور کر دی تمہاری نفری سب سے زیادہ''

(۴) ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے (اقبالؔ)

واسطے سے۔

قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ ادھر تو خلافتِ عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالم اسلام کے قلب میں گویا ملت کی نشاۃِ ثانیہ ہوئی اور ادھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں امتِ مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دور کا آغاز ہو گیا جس کا اصل زور عالمِ اسلام کے میسرہ اور میمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک نا قابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء (Renaissance) کا پورا عمل اسلام ہی کے زیرِ اثر شروع ہوا اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق و مغرب کے علوم و فنون سے روشناس کرایا لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری پیدا ہوئی اور وہاں قوت کا دباؤ (Power Potential) بڑھا، گویا عالمِ اسلام کی شامت آ گئی۔

یورپ مشرق و مغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا (Locked) تھا۔ لیکن مشرق میں عذاب کے وعدۂ اولیٰ کے بعد نشاۃِ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنتِ عثمانیہ عالمِ اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی البتہ مغرب میں اب دولتِ ہسپانیہ ''مرنے والی امتوں کے عالمِ پیری'' کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ لہٰذا ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' کے مصداق یورپی استعمار کا اولین شکار وہی بنی اور پندرہویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہو گیا۔ یہاں تک ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہوئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذابِ استیصال کا نوالہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے یعنی ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ اور ﴿لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ﴾ ''جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے'' اور ''اب ان کے ویران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا''

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گامانے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالمِ اسلام کے میمنہ پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا، ملایا اور ہندوستان مختلف یورپی اقوام کے استبدادی پنجوں میں جکڑے گئے اور یہ عمل جس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا، اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالمِ اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج (Zenith) کو پہنچ گیا۔

اس اثناء میں دولتِ عثمانی بھی اپنے شباب کے دور سے گزر آئی تھی اور اب اس نے بھی 'مردِ بیمار' کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ گویا عالمِ اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہو گیا جو گیارہویں صدی عیسوی میں دولتِ عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رخ عالمِ اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا اور گویا اس کے اعتبار سے بھی ''وعد الآخرۃ'' کا وقت آ پہنچا۔

عالمِ اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولتِ عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہو گئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالمِ عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہِ راست زیرِ نگیں ہو گیا یا بالواسطہ محکومی میں آ گیا اور ہو بہو وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس کی خبر مخبرِ صادق ﷺ نے ان الفاظ میں دی تھی کہ ''ایک زمانہ آئے گا کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے کسی دعوتِ طعام کا اہتمام کرنے والا دستر خوان چُنے جانے پر مہمانوں کو بلایا کرتا ہے''۔

اس طرح بحیثیت مجموعی امتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دورِ ثانی کی تکمیل اس صدی کے ربعِ اول میں ہو گئی تھی جب کہ پورا عالمِ اسلام مغربی استعمار کے ناپاک شکنجے میں جکڑا گیا۔ اگرچہ خاص اُمیّین کے حق میں وعد الآخرۃ کی وہ مکمل صورت جو ﴿لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا﴾ [1] کے الفاظ میں بیان ہوئی تھی تقریباً نصف صدی بعد ۱۹۶۷ء میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب و ملعون قوم کے ہاتھوں ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست دلوائی اور عربوں کے عہدِ تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجدِ اقصیٰ [2] کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا اور اللہ ہی

---

(۱) سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷: ''تو پھر جب آیا وقت دوسرے وعدے کا (تو مسلط کئے تم پر وہ لوگ) تا کہ جلیہ بگاڑ دیں تمہارا اور گھس جائیں مسجد (اقصیٰ) میں جیسے کہ گھسے تھے پہلی بار اور تباہ و برباد کر دیں جس پر بھی قابو پائیں۔''

(۲) یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ روئے ارضی کے دو قبلوں میں سے بے حرمتی اور پامالی کا معاملہ چاروں مرتبہ مسجد اقصیٰ ہی کے ساتھ ہوا جسے غلطی سے قبلۂ اول کہہ دیا جاتا ہے۔ واضح رہنا چاہئے کہ قبلۂ اول بیت اللہ اور مسجد حرام ہے بحوائے الفاظ قرآنی ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ﴾ اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خاص معاملہ رہا ہے وہ واقعۂ فیل سے ظاہر ہے۔ اور راقم کو تو یہی حکمت نظر آتی ہے اس میں کہ مسلمانوں کے سیاسی مرکز کو رفتہ رفتہ اس قبلۂ اول سے دور سے دور تر کیا جاتا رہا تا کہ اس امت کو بھی جب عذابِ الٰہی سے واسطہ پڑے تو اس کے ساتھ خانہ کعبہ کی حرمت بھی مجروح نہ ہو۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ ہی کے اواخر میں مرکزِ عالمِ اسلام مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل ہو گیا۔ پھر وہاں سے بھی دمشق اور بغداد کی جانب نقلِ مکانی ہوئی اور بالآخر انتہائی شمال یعنی قسطنطنیہ کو عالمِ اسلام کے 'دارالخلافہ' کی ◀◀

بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہوگا۔

اس داستان کا الم ناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے امت مسلمہ کی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بو دیئے جو ابھی تک برگ و بار لا رہے ہیں۔ چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا۔ نتیجۃً عالمِ اسلام کا قلب دولخت ہوگیا۔ اور وحدتِ ملی کے علامتی ادارے (Symbol) یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ پھر عالمِ عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالمِ عرب کے کامل اتحاد کا امکان تا حال دور دور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی امتِ مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ ﴿اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ (سورۃ الانعام ۶۵) یعنی تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور پھر چکھائے ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ! چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر ۷۱ء میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشمِ فلک نے دیکھا۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار۔**

بہر حال ہمارے نزدیک اُمیّین کے لئے ۶۷ء کی ذلت اور اٰخَرِین کے ایک اہم حصے کے لئے ۷۱ء کی رسوائی کو امتِ مسلمہ کے زوال و انحطاط کی آخری حد کی حیثیت حاصل ہے اور اگرچہ ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾[1] کی مستقل وعید اب بھی موجود ہے۔ تاہم کیا عجب کہ اب ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ﴾ ہی کی شان کا ظہور ہو اور کلنک کا کوئی اور ٹیکہ امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی پیشانی پر نہ لگے، اگرچہ اس کا تمام تر دارومدار امت کی اپنی اصلاح پر ہے[2]

◄◄ حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس طرح بیت اللہ کم از کم اغیار و اعداء کی دست بُرد سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ (یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے تقدس پر دو ایک مرتبہ خود ان لوگوں کے ہاتھوں کسی قدر آنچ آئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے تھے!)

(۱) سورۃ بنی اسرائیل آیت ۸: ''بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے لیکن اگر تم نے پھر وہی کچھ کیا تو ہم بھی دوبارہ وہی کچھ کریں گے''

(۲) افسوس کہ یہ امید صحیح ثابت نہیں ہوئی (۱۹۹۱ء)

بقول جگر مراد آبادی مرحوم ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ

اور تنظیمِ اسلامی کا محل و مقام

جہاں تک تجدیدی مساعی کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اسلام کا کوئی دور بھی ان سے بالکل خالی نہیں رہا اور ہر زمانے اور ہر ملک میں ایسے اولوالعزم لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق اصلاحی اور تجدیدی کارنامے سرانجام دیئے۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی سے قبل کی ایسی تمام کوششوں کے بارے میں ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہئے اور وہ یہ کہ ان کی اصل نوعیت 'احیاءِ دین' کی نہیں بلکہ حفاظت و مدافعتِ دین کی تھی۔ اس لئے کہ ابھی اسلام کا قصرِ عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا اور خواہ دین کی حقیقی روح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہو چکی ہو بہر حال اسلام نے جو تہذیبی اور عمرانی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار (Intact) تھا حتیٰ کہ شریعتِ اسلامی تمام مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی۔ چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظامِ عقائد و اعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور تک کے تمام مجددینِ امت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقائد و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو ان کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی۔ اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاحِ اخلاق و اعمال، تزکیہ نفس اور تربیتِ روحانی تک۔ اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجددِ دین کی مساعی نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔[1]

(۱) اس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ''خروج'' یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عائد فرما دی تھیں اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی ◄◄

> یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو سابق مجددین کا تجدیدی کام ''جزوی'' نظر آتا ہے اور انہیں حیرت ہوتی ہے کہ امتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کوئی ایک بھی ''مجددِ کامل'' پیدا نہیں ہوا۔

حالانکہ بات بالکل واضح اور سیدھی ہے کہ ابھی عمارت بالکل منہدم ہوئی ہی نہ تھی کہ بالکل نئی تعمیر کی حاجت ہوتی بلکہ صرف شکستہ اور بوسیدہ ہوئی تھی اور ضرورت ہی صرف جزوی اصلاح و استحکام کی تھی۔

یہ تو، جیسا کہ ہم مفصل عرض کر چکے ہیں اس بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا کہ ملتِ اسلامی کا بوسیدہ قصر گویا دفعتہً زمین پر آ رہا اور اسلام اور مسلمان دونوں اپنے زوال و انحطاط کی آخری حدوں کو پہنچ گئے اور ایک طرف کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی حالت حدیثِ نبویؐ کے الفاظ کے مطابق غثاء السیل یعنی سیلاب کے جھاگ سے زیادہ نہ رہی اور دوسری طرف اسلام اور قرآن دونوں بھی آنحضور ﷺ کے الفاظ کے مطابق اس حال کو پہنچ گئے کہ **لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ**[1] لہٰذا قانونِ فطرت کے عین مطابق احیاء کا ہمہ جہتی عمل شروع ہو گیا۔

اس احیائی عمل کے بارے میں بھی بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرِ کار ہیں اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے باعثِ تقویت ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں ہے بلکہ ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾[2] کے مصداق درجہ بدرجہ بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد

◂◂ ''کفرِ بواح''، یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج و تنفیذ نہیں ہو رہی تھی ان کے ذاتی فسق و فجور اور ظلم و جور کے باوجود ان کے خلاف مسلح بغاوت ممکن نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورتحال تبدیل ہوئی اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی دفعتہً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہو گئی جس کی نہایت شاندار اور تابناک مثال خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریک شہیدینؒ ہے۔

(۱) ''ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے اور کچھ نہ بچے گا۔'' (مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم)

(۲) سورۃ الانشقاق آیت ۱۹: ''تم لازماً چڑھو گے سیڑھی بہ سیڑھی''

کے مراحل سے گزر کر پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے، اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے[1] تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

> ماضی میں ان حقائق کے پیشِ نظر نہ رہنے کے باعث بہت سے لوگوں کے دلوں میں ''مہدیٔ موعود'' یا ''مجددِ کامل'' بننے کا شوق پیدا ہوتا رہا ہے جس کے نتیجے میں طرح طرح کے فتنے اٹھتے رہے ہیں اور اچھی بھلی تعمیری کوششوں کا رخ تخریب کی جانب مڑ جاتا رہا ہے!

اس احیائی عمل کا اولین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہ راست تسلط سے نجات کا حصول تھا جو بحمد للہ گزشتہ تیس چالیس سال کے دوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوامِ مغرب کی سائنسی و تکنیکی بالادستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں، تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیۂ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریٹیریا کے علاوہ پورے کرۂ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہِ راست غلامی و محکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی و نظریاتی اور تصوریت پسندانہ (Idealistic) نقطۂ نظر سے تو ''مسلمان اقوام'' کی اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے۔ اس لئے کہ از روئے قرآن و حدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا امت یا حزب کی ہے نہ کہ قوم کی۔ اور وہ ایک ناقابلِ تقسیم 'وحدتِ ملی' میں منسلک ہیں جس میں تعدد و تکثر کا امکان ہی موجود نہیں کہ اقوام کا لفظ صحیح قرار دیا جا سکے۔ لیکن واقعیت پسندانہ (Realistic) نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا امت یا حزب کا کردار (Role) تو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ وحدتِ ملی کا تصور اس صدی کے آغاز تک برقرار تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اس صدی کے رُبع اول کے دوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اس وقت فی الواقع روئے

(۱) افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا (اقبالؔ)

ارضی پر کوئی ایک 'امتِ مسلمہ' آباد نہیں ہے بلکہ بہت سی مسلمان اقوام آباد ہیں۔

اسی طرح خالص تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ع ''نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے'' کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خودمختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھئے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل ہی نئی قوم کے حوالے فرمادے اور ﴿یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ﴾ کی شان دوبارہ ظاہر ہو۔ لیکن بحالاتِ موجود تو ع ''کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے'' کے مصداق اسلام کا مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور دونوں باہم لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اندریں حالات، مسلمان اقوام کا آزادی وخوداختیاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سر ہوا ہے ان کی سعی بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہی کی جدوجہد کا جزو قرار پائے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین ومذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا تو اس کا جواب ہے نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظ مبارکہ میں کہ اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ (بخاری: کتاب الجہاد) واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کام بہت نرالے ہیں اور اس کی تدبیریں بہت لطیف اور مخفی اور اس کے منصوبے بہت طویل الذیل اور وسیع الاطراف ہوتے ہیں اور وہ بسا اوقات فساق وفجار سے اپنے دین کی خدمت لے لیتا ہے۔ ﴿وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصولِ آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لئے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال (Invoke) کیا گیا، انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظامِ فکر کے ساتھ سوائے تبایُن وتضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے، لیکن عالمِ واقعہ میں اس کے سوائے کوئی چارہ کار موجود نہ تھا۔ اس لئے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی وقلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعال تحریک کی اساس بنایا جا سکتا اور حصولِ استقلال کے لئے جس مؤثر مزاحمت (Effective Resistance) کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات (Concrete Ground) ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہو گیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام ونشان بھی صفحۂ ارضی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اس وقت مسلمانانِ عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں، اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے لئے واحد موجود (The Only Available) بنیاد بن سکتا تھا اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے، بشرطیکہ اسے نظامِ فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کرلیا جائے اور حصولِ آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدتِ ملی کے شعور واحساس کو اجاگر کیا جائے۔

اس پس منظر میں دیکھئے تو تحریکِ پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے تو اس کے لئے بھی وجہ جواز موجود تھی۔ (۱) لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات کے باعث مسلمانانِ ہند نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز ہی ''مسلم قومیت'' کی اساس پر کیا جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرح جو اپنا نام ''سلمان ابن اسلام'' بتایا کرتے تھے، صرف اور صرف 'فرزندِ اسلام' قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کے قیام اور بقا کے لئے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان ع ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ؐ'' کے مصداق اپنی پیدائش (Genesis) اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے تمام مسلمان ممالک سے ایک قدم آگے ہے اور دوسروں کو ع ''قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم'' کا جو کٹھن مرحلہ ابھی طے کرنا ہے وہ کم از کم اصولی اور نظری اعتبار سے یہاں پہلے ہی سے طے شدہ ہے۔

مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد کو اس رخ پر ڈالنے والے اسباب وعوامل میں سلبی ومنفی طور پر سب سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی ''ہزار سالہ شکست کا انتقام'' لینے کے اس جذبے کو حاصل ہے جو ان کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرزِ عمل بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ

---

(۱) چنانچہ جمعیت علمائے ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی، بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خودنوشت سوانح 'نقشِ حیات' میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہدِ کبیر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانانِ پنجاب کو 'سکھا شاہی' سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

کے لئے ممد و معاون بن گیا اور ہم اپنے سابق ابنائے وطن کی خدمت میں بجا طور پر عرض کر سکتے ہیں کہ ؎

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک تو یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبہ ملی باقی تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنسیخِ خلافت (Abolition of Caliphate) پر جس قدر شدید ردعمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عُشرِ عشیر بھی کہیں اور نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدوجہد کا عنوان ہی 'تحریک خلافت' بن گئی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ اس خطے میں علامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جس کی انتہائی پُر درد و پُر تاثیر حُدی خوانی نے قافلۂ ملی کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور مسلمانانِ ہند کو جذبۂ ملی سے سرشار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری امتِ مسلمہ پر علامہ مرحوم کا ایک بہت بڑا احسان ہے اور بلاشبہ ان کی ملی شاعری کو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کی وسیع الاطراف جدوجہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اور اس پس منظر (Context) میں دیکھا جائے تو عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی [۱] خیز ہے، جہاں قریباً ثلث صدی قبل قرارداد پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلۂ ملتِ اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا لگاتا رہا کہ ؎

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
دِلے در سینۂ ملا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر ہند و پاک کو پورے عالمِ اسلام میں ایک امتیازی مقام

(۱) خیال رہے کہ یہ مضمون اکتوبر ۷۴ء میں لکھا گیا تھا۔

حاصل ہے چنانچہ علماء دین کو جس قدر اثر (Hold) یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا اور راسخ العقیدہ اسلام (Orthodox Islam) جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا۔ [۱] حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب بھی، جہاں اس صدی کے وسط تک محمد ابن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

اس کی وجہ بھی بادنیٰ تامل سمجھ میں آ جاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں پورے عالمِ اسلام میں پیدا نہیں ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علمِ دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکرِ اسلامی کی تدوینِ نو کا جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجالِ دین کی ساکھ از سرِ نو مضبوط ہو گئی۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ علماء دین کی مساعی میں اصل زور (Emphasis) دورِ حاضر میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی حفاظت و مدافعت ہی پر ہے۔ اس طرح گویا ظاہری اعتبار سے ان کی خدمات کو سابق مجددینِ اسلام کی مساعی کیساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے۔ اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے بعض اہم فرق بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلیدِ جامد کا دور دورہ ہوا اور تشتّت و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جما لئے، ہر فرقے کے علماءِ کرام دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو ان کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے، جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دوسرے چونکہ انہوں نے علومِ جدیدہ اور دورِ حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہِ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دور میں امام غزالی اور امام ابن تیمیہ رحمہما اللہ نے کیا تھا لہٰذا وہ دورِ حاضر میں حفاظت و مدافعتِ دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔

لہٰذا دورِ حاضر میں علماء دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے

(۱) ۶۰ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب "Islam" کے خلاف ہوا تھا اور اب جو تازہ 'معجزہ' قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا ہے وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔

والے انجن کی تو نہیں ہے البتہ کم از کم برصغیر پاک و ہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرور ہے جو اس کشتی کو غلط رخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہرحال سرانجام دے سکتا ہے۔ اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے۔

برصغیر میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتبِ فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے 'فکر' کا نہ سہی 'علم' کا وارث ضرور ہے۔ اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ توجہات کو حقائقِ ایمانی پر مرتکز (Focus) کر دیا اور جس کے زیرِ اثر کم از کم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہو رہے ہیں جن کے اذہان فکری و نظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی میں سہی بہرحال موجود ضرور ہوتا ہے۔ ہماری مراد جماعتِ تبلیغی سے ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکت عالمِ اسلام ہی نہیں دیارِ غیر میں بھی برپا کر دی ہے اور جس کے زیرِ اثر عوامی سطح ہی پر سہی بہرحال 'تجدیدِ ایمان' کی ایک تحریک بالفعل برپا ہوگئی ہے اور جسے بلاشبہ زیرِ بحث 'ہمہ جہتی احیائی عمل' میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اس 'ہمہ جہتی احیائی عمل' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرِکار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کر رہی ہیں لیکن ع ''ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم'' اور ''ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم'' کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں سے اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

برصغیر میں اس تحریکِ احیائے دین کے مؤسسِ اولین اور داعئ اول کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے ''حکومت الٰہیہ'' کے قیام اور اس کے لئے ایک ''حزب اللہ'' کی تاسیس کی پُرزور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے خصوصاً تحریکِ خلافت کے دوران میں ان کی شہرت کو برصغیر کے طول و عرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ لیکن اس کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سبب سے انہوں نے اس عظیم مشن کو خیرباد کہہ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔

مولانا کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کے ممکن اسباب میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ع ''اے روشنئ طبع تو برمن بلا شدی!'' مولانا بلاشبہ عبقری تھے اور عبقری انسان زیادہ عملی نہیں ہوا کرتے۔ اس کا کچھ سراغ ان کے اس جملے میں بھی ملتا ہے کہ ''ہم بیک وقت گلیمِ زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں۔'' اور ایک خیال جو زیادہ قرینِ قیاس ہے یہ بھی ہے کہ مولانا کی حیثیت ایک سکہ بند اور مسلّم عالم دین کی نہ تھی اور اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر علماء کی گرفت بہت مضبوط تھی لہٰذا مولانا کو گویا راستہ بند نظر آیا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ آٹھ سال کے عرصے میں [1] اپنے پیش نظر مقصد کے لئے تمہیدی مراحل کی تکمیل کے بعد اپریل ۱۹۲۰ء میں مولانا نے دہلی میں منعقدہ جمعیت علمائے ہند کی کانفرس میں مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مرحوم کے تعاون سے اگلا قدم اٹھانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ پہلے خود انہوں نے تقریر کی اور اپنے جوشِ خطابت سے حاضرین کے جذبۂ عمل کو ابھارا ہی نہیں للکارا۔ اور پھر مولانا احمد سعید صاحب نے تقریر کی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد سے مسلمانانِ ہند کی قیادت کی مسند خالی ہے۔ اور اب جو مرحلہ درپیش ہے اس میں 'شیخ الہند' سے بھی بڑھ کر 'امام الہند' کی ضرورت ہے۔ اب غور کرو اور اس کے لئے کسی موزوں شخص کو تلاش کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جدوجہد کا آغاز کر دو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی مطلوب تھا۔ چنانچہ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری اٹھے اور انہوں نے براہِ راست مولانا آزاد کو خطاب کر کے ان الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا کہ ''ایاز قدرِ خود بشناس!'' جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری تقریر میں کیا کچھ ہوگا۔ بہرحال اس سے دل شکستہ اور دلبرداشتہ ہو کر مولانا اس کام ہی

---

(۱) 'الہلال' کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا۔

سے دست کش ہوگئے اور اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔[1]

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تو میدان چھوڑ گئے لیکن ان کی زوردار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضائیں دیر تک گونجتی رہیں۔ اور پھر کم وبیش دس ہی سال بعد ایک باہمت نوجوان[2] نے مولانا کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ ان کی تفسیر 'ترجمان القرآن' ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اسی 'حکومت الٰہیہ' کے قیام کا نصب العین اور ''تجدید واحیائے دین'' کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔

اس نوجوان میں مولانا مرحوم کی بہ نسبت جوش کم تھا، ہوش زیادہ، ذہانت وفطانت قدرے کم تھی لیکن اسی نسبت سے محنت ومشقت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ لہٰذا اس نے پہلے چھ سات برس تک پورے صبر واستقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا۔ کچھ عرصہ 'دارالاسلام' کے نام سے ایک ادارے کے تحت کام کیا اور بالآخر ۴۱ء میں 'جماعت اسلامی' کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظّم جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

جماعت کے قیام سے قبل اس نوجوان نے پہلے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل یا اس کے حلیف علماء کے موقف پر شدید تنقید کی اور اپنے زورِ استدلال سے ان کے طریقِ کار کا انجامِ کار کے اعتبار سے اسلام اور مسلمان دونوں کے حق میں سخت مضر ہونا ثابت کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی قومی سیاست پر مدلل تنقید کی اور اسلام کے بلند ترین تصوریت پسندانہ موقف کے تقابل سے اس کا 'خلافِ اسلام' ہونا ثابت کیا اور خود اسی بلند ترین تصوریت پسندانہ سطح (Highest Idealistic Level) پر اپنی جماعت کی اساس رکھ دی۔

چنانچہ جماعت اسلامی کے اساسی موقف کا خلاصہ یہ قرار پایا کہ:

۱۔ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک کامل نظریۂ حیات اور مکمل نظامِ زندگی کی ہے جو اپنی عین فطرت کے تقاضے کے طور پر اپنا کُلّی نفاذ اور کامل غلبہ چاہتا ہے۔

۲۔ عبادت صرف مراسمِ عبودیت کا نام نہیں، بلکہ اس نظام کی کُلّی اطاعت کا نام ہے۔

(۱) اس موضوع پر تفصیلی بحث ہماری تالیف ''جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مؤسس جماعتِ اسلامی

۳۔ مسلمان قوم نہیں، امت مسلمہ اور حزب اللہ ہیں اور ان کی اصل حیثیت ایک نظریاتی جماعت (Idealistic Party) کی ہے جس کا اولین مقصد اپنے نظریات کے مطابق انقلاب برپا کرنا اور اپنے نظامِ زندگی کو بالفعل قائم کرنا ہے۔

۴۔ دنیا کے موجودہ غیر مسلموں کی ایک عظیم اکثریت قانوناً تو کافر ہے لیکن حقیقتاً کافر نہیں۔ اس لئے کہ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش ہی نہیں کی گئی کہ ان کے انکار یا رد کر دینے کا سوال پیدا ہو۔

۵۔ اسی طرح دنیا کے موجودہ مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت بھی صرف 'قانونی اور نسلی' مسلمانوں پر مشتمل ہے، نہ کہ حقیقی مسلمانوں پر۔ اس لئے کہ نہ ان کے قلوب واذہان میں اسلام کی نظریاتی واعتقادی اساسات راسخ ہیں، نہ ان کے عمل میں اسلامی قانون کی پابندی اور شریعت کا التزام ہی پایا جاتا ہے۔

۶۔ مسلمانوں کے قومی مفادات کے تحفظ اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت یا ان کی آزادی اور خود اختیاری کے حصول کی جدوجہد کا اسلام کی نشاۃِ ثانیہ یا احیائے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۷۔ 'کرنے کا اصل کام' یہ ہے کہ اولاً ...... بلا لحاظ مذہب وملت پوری نوعِ انسانی کو بندگیٔ رب کی طرف پکارا جائے اور اسلام کی نظریاتی اساسات کو شعوری طور پر قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور...... پھر سابق غیر مسلموں یا نسلی مسلمانوں میں سے جنہیں بھی اللہ تعالیٰ اسلام کو شعوری طور پر قبول کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔ ان کی قوتوں کو ایک ہیئت تنظیمی کے تحت مجتمع کر کے غلبۂ دینِ حق یا 'حکومتِ الٰہیہ'[1] کے قیام کی منظّم جدوجہد کی جائے۔

۸۔ اس جدوجہد میں اولین اہمیت علمی وفکری انقلاب کو حاصل ہے، پھر عملی واخلاقی تبدیلی اور معاشرتی اصلاح کو۔ نظامِ حکومت کی تبدیلی کا مرحلہ ان سب کے بعد آتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس موقف میں انتہا پسندی کی شدت تو موجود ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا ٹھیٹھ نظریاتی اور اصولی موقف یہی ہے۔ اور دوسری احیائی مساعی کے ساتھ ساتھ اس خالص اصولی اساس پر کسی تحریک کا اٹھنا وقت کی اہم ضرورت تھی جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ہاتھوں

(۱) واضح رہے کہ جب جماعت اسلامی کے قیام کے کچھ عرصہ بعد مولانا اصلاحی کا قرآنی فکر بھی اس تحریک کے ساتھ آ شامل ہوا تو 'حکومتِ الٰہیہ' کی اصطلاح سرے سے متروک ہوگئی اور اس کی جگہ 'شہادتِ حق' اور 'اقامتِ دین' کی خالص قرآنی اصطلاحوں نے لے لی۔

پوری ہوئی اور ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اس پر کہ مولانا موصوف اور ان کے رفقائے کار حالات کی سخت نامساعدت کے علی الرغم اور ہر طرح کے طعن وطنز اور تمسخر واستہزاء کے باوجود مسلسل چھ سال اس موقف پر ڈٹے رہے۔ نتیجۃً عزیمت کی نہایت اعلیٰ مثالیں چشمِ فلک نے دیکھیں اور ع ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں ایک نہایت درخشاں باب کا اضافہ ہوگیا۔ اس طرح گویا وہ کام جسے احیائے اسلام کے 'راست اقدام' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جس کا ابتدائی خاکہ (Blue Print) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے تیار کیا تھا، عملاً مولانا مودودی کے ہاتھوں شروع ہوا۔

لیکن افسوس کہ ع ''خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود!'' کے مصداق مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی اس بلند وبالا موقف پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اور ۴۷ء میں جیسے ہی مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان کے نام سے ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوئی اور متعدد اسباب سے ایک توقع سی نظر آئی کہ یہاں اسلام کے نام پر ایک سیاسی تحریک چلائی جا سکتی ہے، انہوں نے اپنے اصولی موقف کو ترک کر کے بغیر اس کے کہ کوئی عملی وفکری انقلاب آیا ہو یا اخلاقی وعملی تبدیلی معاشرے میں برپا ہوئی ہو، نظامِ حکومت کی 'اصلاح' کے لئے عملی سیاسیات کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ توقع تو موہوم سے موہوم تر ہوتی چلی گئی البتہ سیاست کی سنگلاخ وادی میں یہ تحریک ﴿وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾[1] کے مصداق پست تر موقف اختیار کرنے پر مجبور ہوتی چلی گئی۔

پہلے خیال تھا کہ خالص اسلام کے نام اور محض اپنے زورِ بازو کے بل پر یہ مرحلہ سر ہو جائے گا لہٰذا کمال شانِ استغناء کے ساتھ دوسری سیاسی جماعتوں کی اشتراکِ عمل کی پیش کشوں کو ٹھکرا دیا گیا۔ جب پنجاب کے ۵۱ء کے الیکشن کے بعد یہ مغالطہ دور ہوا تو خیال ہوا کہ مذہب کے نام پر دوسری مذہبی جماعتوں کے تعاون سے یہ مہم سر کی جائے۔ پھر جب معلوم ہوا کہ یہ بھی ممکن نہیں اور چڑھائی اتنی سخت ہے کہ گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو گویا پہلا گیئر آزمایا گیا اور ایک درجہ اور نیچے اتر کر محض جمہوریت کے نام پر مذہبی ولا دینی تمام عناصر کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی۔

سابق صدر ایوب مرحوم کا پورا گیارہ سالہ دورِ حکومت اسی ''بحالئ جمہوریت'' کی مہم کی نذر ہو گیا۔ لیکن جب ان کے اقتدار کی عمارت گری تو اس کے ملبے سے کچھ 'اور' ہی برآمد ہو گیا۔

ہمارے پیشِ نظر اس وقت نہ تو تاریخ نگاری ہی ہے نہ ہی جماعتِ اسلامی کے مستقبل کے بارے

(۱) سورۃ الاعراف آیت ۱۷۶: ''لیکن وہ تو زمین ہی میں دھنس کر رہ گیا''

میں کوئی پیش گوئی یا قیاس آرائی، نہ ہم اس وقت اس بحث ہی میں الجھنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی کے اس 'انقلابِ حال' کے اسباب کیا تھے (اس پر ہم اپنی تالیف ''تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' میں مفصل بحث بھی کر چکے ہیں) ہمیں اس معاملے کے جس پہلو سے اصل دلچسپی ہے وہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اس 'انتقالِ موقف' سے احیائے اسلام کے ہمہ جہتی عمل میں ٹھیٹھ اصولی اسلامی تحریک کی جگہ پھر خالی ہوگئی اور اس مہیب خلا کو پُر کرنے کی کوئی صورت تا حال پیدا نہیں ہوئی جو اپنے پیش رو مولانا آزاد اور ان کی جماعت حزب اللہ کی طرح مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی نے جیتے جی مرحوم ہو کر پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اب اگرچہ سیاسی وقومی سطح پر بھی احیائی عمل جاری ہے اور علماء کرام کی سرگرمیاں بھی اپنے اپنے رنگ میں تیز سے تیز تر ہو گئی ہیں، احیائی عمل کا یہ تیسرا اور اہم ترین گوشہ ویران وسنسان پڑا ہے!

جماعتِ اسلامی کے موقف میں یہ تبدیلی اصولاً ۴۷ء ہی میں پیدا ہو گئی تھی لیکن کم وبیش دس سال یہ اپنی قوت کے زور میں بڑھتی چلی گئی اور اس تبدیلی کا احساس بھی لوگوں کو نہیں ہوا۔ لیکن ۵۶-۵۷ء میں جماعت میں اس احساس نے زور پکڑا اور طریق کار کے بارے میں ایک اختلافِ رائے ظاہر ہوا جس نے ایک ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجۃً جماعت کے 'اکابر' کی اکثریت چند 'اصاغر' سمیت جماعت سے کٹ گئی۔ اُن 'اصاغر' میں سے ایک ان سطور کا راقم بھی ہے۔ بعد ازاں 'بڑے' تو اپنے اپنے 'بڑے' کاموں میں مشغول ومصروف ہو گئے لیکن یہ 'چھوٹا'

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

کے مصداق اپنے دل ودماغ کو اس جنتِ گم گشتہ کے خیال سے فارغ نہ کر سکا، بلکہ جیسے جیسے دن بیتے اس کا حال یہ ہوتا چلا گیا کہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے یہ الفت اور محکم ہو گئی

وہ جب جماعت سے علیحدہ ہوا اس کی عمر کُل پچیس برس تھی۔ بالکل نوعمری کا عالم، نہ علم نہ تجربہ، لہٰذا پورے دس برس اس نے اس انتظار میں بسر کئے کہ 'بڑوں' میں سے کوئی ہمت کرے اور از سرِ نو سفر کا آغاز کر دے۔ لیکن اللہ کو یہ بھی منظور نہ ہوا تا آنکہ ۶۶-۶۷ء میں اس نے خود کمرِ ہمت کسی اور بفحوائے

الفاظِ قرآنی ﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ ﴾ [1] درسِ قرآن کی صورت میں ٹھیٹھ اسلامی دعوت کے لئے ذہنی وفکری سطح پر میدان ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کے کام کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور چند ہی سالوں میں اس کے قائم کردہ ’حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن‘ کی کوکھ سے ’مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور‘ برآمد ہوگئی اور اب اس کے بھی دو ہی سال بعد وہ اسی ٹھیٹھ اصولی اسلامی تحریک کے احیاء کے لئے ’’تنظیمِ اسلامی‘‘ کے قیام کا ارادہ کر رہا ہے۔

اسے خوب معلوم ہے کہ اس کے پاس نہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی سی عبقریت اور ذہانت وفطانت ہے، نہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی سی صلاحیتِ کار اور محنت ومشقت کا مادہ۔ پھر نہ وہ شعلہ بیان خطیب ہے نہ صاحب طرز ادیب، بایں ہمہ ایک احساسِ فرض ہے جو چین نہیں لینے دیتا اور ایک عظیم تحریک کی امانت کے بار کا احساسِ گراں ہے جس نے اسے ع ’ہر چہ بادا باد، ماکشتی در آب انداختیم‘‘ کے مصداق اس پُر خطر وادی میں کود پڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اب جو لوگ شخصیتوں اور جماعتوں کی سطح سے بلند ہو کر سوچنے اور غور وفکر کرنے کی ہمت اور صلاحیت ہی سے عاری ہوں ان کا معاملہ تو دوسرا ہے، البتہ وہ لوگ جو کسی تحریک کے بنیادی نظریات ومقاصد پر نظر رکھتے ہوئے اپنے موقف پر نظر ثانی کی ہمت کر سکیں، ان کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ انہیں چاہئے کہ ٹھنڈے دل کے ساتھ ہمارے موقف پر غور کریں اور اگر انہیں اس میں صحت وصداقت نظر آئے تو ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں اور کمر ہمت کسیں! بہر حال اپنی حد تک ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ۔

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا
سرافگندیم، بسم اللہ مجرٖھا ومرسٰھا

---

(۱) ’’یقیناً یہی قرآن ہے جو رہنمائی فرماتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی اور سب سے درست ہے۔‘‘
عجب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ الفاظ مبارکہ سورۂ بنی اسرائیل میں ان آیات کے فوراً بعد وارد ہوئے ہیں جو بنی اسرائیل اور امتِ مسلمہ کی تاریخ میں مماثلت ومشابہت کے بیان میں اس تحریر میں تفصیل کے ساتھ زیر بحث آچکی ہیں۔ مزید غور طلب نکتہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ذکر شروع ہوا تورات کے ذکر سے ﴿وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ اور اس کا اختتام ہوا قرآن کے ذکر پر۔ گویا سابق امت کی تاسیس بھی کتاب ہی کی بنیاد پر ہوئی تھی اور اس کے معزول کئے جانے کے بعد نئی امتِ مسلمہ کی تاسیس بھی ’’الکتٰب‘‘ ہی کی بنیاد پر ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ’تجدید‘ کے لئے بھی مبنیٰ واساس قرآن کے سوا کوئی چیز نہیں بن سکتی ۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست جز بہ قرآن زیستن   (اقبالؒ)

ضمیمہ

نزولِ قرآن سے قبل

تاریخ بنی اسرائیل کے چار دَور

(ماخوذ از تفہیم القرآن، تالیف سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم)

بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو...... انہوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔

۱۔ عروجِ اول: عہدِ زریں

آخر کار بنی اسرائیل کو ایک فرمانروا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی درخواست پر حضرت سموئیل نبی نے ۱۰۲۰ قبل مسیح میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا۔

اس متحدہ سلطنت کے تین فرمانروا ہوئے۔ طالوت (۱۰۲۰ تا ۱۰۰۴ ق م)، حضرت داؤد علیہ السلام (۱۰۰۴ تا ۹۶۵ ق م) اور حضرت سلیمان علیہ السلام (۹۶۵ تا ۹۲۶ ق م)۔ ان فرمانرواؤں نے اس کام کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔

۲۔ زوال اور عذاب کا پہلا دور

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور شرق اردن میں سلطنت اسرائیل، جس کا پایۂ تخت آخر کار سامریہ قرار پایا۔ اور جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقے میں سلطنت یہودیہ جس کا پایۂ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اول روز سے شروع ہوگئی اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہ حالت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ حضرت الیاس اور حضرت الیسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی مگر یہ قوم جس تنزل کی

طرف جارہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب اشوریوں کی شکل میں دولت اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر اشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے۔ اس دور میں عاموس نبی (۷۸۷ تا ۷۴۷ قبل مسیح) اور پھر ہوسیع نبی (۷۴۷ تا ۷۳۵ قبل مسیح) نے اٹھ کر اسرائیلیوں کو پے در پے تنبیہات کیں، مگر جس غفلت کے نشے میں وہ سرشار تھے وہ تنبیہہ کی ترشی سے اور زیادہ تیز ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ خدا کا عذاب اسرائیلی سلطنت اور اس کے باشندوں پر ٹوٹ پڑا۔ ۷۲۱ قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرمانروا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا، ہزارہا اسرائیلی تہ تیغ کئے گئے، ۲۷ ہزار سے زیادہ بااثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا اور دوسرے علاقوں سے لا کر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی، وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بداخلاقی میں مبتلا ہو گئی مگر نسبتہً اس کا اعتقادی اور اخلاقی زوال دولتِ اسرائیلی کی بہ نسبت سست رفتار تھا، اس لئے اس کو مہلت بھی کچھ زیادہ دی گئی۔ پھر جب حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی اور بداخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۸ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو مسخر کر لیا اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی، یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بری طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔ یہ تھا وہ پہلا فساد جس سے بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا تھا اور یہ تھی وہ پہلی سزا جو اس کی پاداش میں ان کو دی گئی۔

جہاں تک سامریہ اور اسرئیل کے لوگوں کا تعلق ہے، وہ تو اخلاقی و اعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اٹھے، مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا۔ اس نے ان لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے کھچے رہ گئے تھے اور ان لوگوں کو بھی توبہ و انابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ آخر کار رحمت الٰہی ان کی مددگار ہوئی۔ بابل کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ۵۳۹ قبل مسیح میں ایرانی فاتح سائرس (خورس یا خسرو) نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرمان جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے چنانچہ اس کے بعد یہودیوں کے قافلے پر قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے جن کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ آخر داریوس (دارا) اول نے ۵۲۲ ق م میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زروبابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حجی نبی، زکریا نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکل مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔ پھر ۴۵۸ ق م میں ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ حضرت عزیر (عزرا) یہودیہ پہنچے۔

۳۔ عروجِ ثانی: دولتِ مکابی

حضرت عزیر نے دین موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انہوں نے یہودی قوم کے تمام اہل خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائبل کی کتب خمسہ کو جن میں تورات تھی، مرتب کر کے شائع کیا۔ یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا، قوانین شریعت کو نافذ کر کے ان اعتقادی اور اخلاقی برائیوں کو دور کرنا شروع کیا جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں، ان تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے اور بنی اسرائیل سے از سر نو خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔

ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندر اعظم کی فتوحات اور پھر یونانیوں کے عروج سے یہودیوں کو کچھ مدت کے لئے ایک سخت دھکا لگا۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت جن تین سلطنتوں میں تقسیم ہوئی تھی، ان میں سے شام کا علاقہ اُس سلوقی سلطنت کے حصے میں آیا جس کا پایہ تخت انطاکیہ تھا اور اس کے فرمانروا انٹیوکس ثالث نے ۱۹۸ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یہ یونانی فاتح، جو مذہباً مشرک اور اخلاقاً اباحیت پسند تھے، یہودی مذہب و تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کیا۔

۱۷۵ ق م میں انٹیوکس چہارم جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جابرانہ طاقت سے کام لے کر

یہودی مذہب وتہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔لیکن یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اوران کے اندرایک زبردست تحریک اٹھی جوتاریخ میں مکابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔عام یہودیوں میں حضرت عزیر کی پھونکی ہوئی روحِ دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکابیوں کے ساتھ ہوگئے اورآخر کارانہوں نے یونانیوں کونکال کراپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کرلی جو ۶۷ ق م تک قائم رہی۔اس ریاست کے حدودپھیل کررفتہ رفتہ اس پورے رقبے پرحاوی ہوگئے جوکبھی یہودیہ اوراسرئیل کی ریاستوں کے زیرنگیں تھے، بلکہ فلستیہ کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آگیا جوحضرت داؤد وسلیمان علیہاالسلام کے زمانے میں بھی مسخر نہ ہوا تھا۔

مکابیوں کی تحریک جس اخلاقی ودینی روح کے ساتھ اٹھی تھی وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی اوراس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہرداری نے لے لی۔آخرکاران کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے خود رومی فاتح پومپی کوفلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی ۶۳ ق م میں اس ملک کی طرف متوجہ ہوااوراس نے بیت المقدس پر قبضہ کرکے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کردیا۔انہوں نے فلسطین میں اپنے زیرسایہ ایک دیسی ریاست قائم کردی جو بالآخر ۴۰ ق م میں ایک ہوشیار یہودی ہیرود نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرودِاعظم کے نام سے مشہور ہے۔اس کی فرمانروائی پورے فلسطین اور شرق اردن پر ۴۰ سے ۴ قبل مسیح تک رہی۔اس نے ایک طرف مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کرکے یہودیوں کوخوش رکھااوردوسری طرف رومی تہذیب کوفروغ دے کراوررومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرکے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی۔اس زمانے میں یہودیوں کی دینی واخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حدکوپہنچ چکی تھی۔

ہیرود کے بعداس کی ریاست تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔

اس کا ایک بیٹاارخلاؤس سامریہ، یہودیہ اورشمالی ادومیہ کا فرمانرواہوا مگر ۶ ء میں قیصرآگسٹس نے اس کومعزول کرکے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کردی اور ۴۱ ء تک یہی انتظام قائم رہا۔ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لئے اٹھے اور یہودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کران کی مخالفت کی اوررومی گورنر پونٹس پیلاطس سے ان کوسزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔(اوراپنے خیال کے مطابق توان کوسولی پرچڑھاہی دیا!)

ہیرود کا دوسرا بیٹا ہیرودانیٹی پاس شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اورشرق اردن کا مالک ہوااوریہی وہ شخص ہے جس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پرحضرت یحییٰ علیہ السلام کا سرقلم کرکے اس کی نذرکیا۔

اس کا تیسرا بیٹا فلپ، کوہ حرمون سے دریائے یرموک تک کے علاقے کا مالک ہوااور یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بھی بڑھ کررومی ویونانی تہذیب میں غرق تھا۔

۴۱ ء میں ہیرود اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کورومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرمانروا بنادیا جن پر ہیروداعظم اپنے زمانے میں حکمراں تھا۔اس شخص نے برسراقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السلام کے پیرووں پرمظالم کی انتہا کردی اوراپناپورازورخداترسی واصلاحِ اخلاق کی اس تحریک کوکچلنے میں صرف کر ڈالا جوحواریوں کی رہنمائی میں چل رہی تھی۔

۴۔زوال وعذاب کا دوسرا دور

اس پرتھوڑا زمانہ ہی گزرا تھا کہ یہودیوں اوررومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہوگئی اور ۶۴ ء اور ۶۶ ء کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کردی۔ ہیرود اگرپا ثانی اور رومی پروکیوریٹر فلورس، دونوں اس بغاوت کوفروکرنے میں ناکام ہوئے۔آخرکاررومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اس بغاوت کوکچل ڈالااور ۷۰ ء میں ٹیٹس نے بزورشمشیریروشلم کوفتح کرلیا۔اس موقع پرقتل عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزارآدمی مارے گئے، ۶۷ ہزارآدمی گرفتارکرکے غلام بنائے گئے، ہزارہا آدمی پکڑپکڑکر مصری کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے، ہزاروں آدمیوں کوپکڑکرمختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اورکلوسیموں میں ان کوجنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیرزنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لئے استعمال کیا جائے۔تمام درازقامت اورحسین لڑکیاں فاتحین کے لئے چن لی گئیں اوریروشلم کے شہراورہیکل کومسمارکرکے پیوندِ خاک کردیا گیا۔اس کے بعدفلسطین سے یہودی اثر واقتدارایسا مٹا کہ دوہزار برس تک اس کوپھرسراٹھانے کا موقع نہ ملا اوریروشلم کا ہیکل مقدس پھرکبھی تعمیر نہ ہوسکا۔ بعد میں قیصر ہیڈریان نے اس شہرکودوبارہ آباد کیا مگراب اس کا نام ایلیا تھا اوراس میں مدت ہائے درازتک یہودیوں کوداخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

یہ تھی وہ سزا جوبنی اسرائیل کودوسرے فسادِعظیم کی پاداش میں ملی۔